جاوید شاہین

بوجھل ہے بہت زخمِ مسلسل کی ہری شاخ
جس رُت میں بھی جو پھول کھِلا ساتھ ہے میرے

مکتبہ میری لائبریری ، لاہور

زخمِ مسلسل
کی
ہری شاخ
جاوید شاہین

مُنیر نیازی ـــــ

ـــــ کے نام!

ترتیب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اوّل لفظ

کچھ پُرانے وقتوں کے جائزے اور اپنے زمانے کے خاص مشاہدے کے بعد
ں طوعاً و کرہاً اب یہ بات ماننے کے لیے تیار ہوتا ہُوں کہ ایک اچّھا شاعر ایک غیر اچھّا
سان بھی ہو سکتا ہے۔

مگر یہ قانُونِ قُدرت ہرگز نہیں۔

اپنے کم پن میں اگر کوتاہی ہے تو وُہ اِنسان ہی کی ہے۔ اصیل شاعری خُدا خود
یتا ہے، اور اپنی اِنسانیت میں تکمیل اِنسان خود۔

میرا یہ ایمان ہے کہ ایک اصیل شاعر ایک عظیم اِنسان بھی ہو سکتا ہے۔

بھلا اپنے خُدا سے اِس رغبت کو پا کر یہ کوئی ضروری ہے کہ انسان اپنے کو گھٹیا
اور محتاج ہی رہنے دے اور خود اتنی سعی بھی نہ کر پائے کہ اپنی زندگی کی سنوار میں تکمیل کا حامل ہو
یہ لازم آتا ہے اس لیے کہ یہ دونوں عمل ہمارے قلب پہ یک جا جُزو ہیں۔ بینائی
کی جس دھار ہم خُدا کو دیکھتے ہیں، اسی دھار کی جُنبش وہ ہم میں سمائے ہے۔

ان دونوں اطوار کو ہم رفتار بنانا آسان نہیں اور نہ ہی ہر کس و ناکس کا کام ہے۔
اس واسطے اس ہمارے قرن کی دُنیا میں بہت کم خوش بخت و خوش فعل ایسے ہُوئے ہیں کہ
جن کو خُدا سے دین بخشی گئی اور جنہوں نے اپنے سے اِنسانیت کو تکمیل بخشی۔ خُدا ہمارا رب ہے

اور رب کا مطلب ہے جو پال کر اکمل کرے ۔ سو اِس سہار کی زندگی میں ہماری طلب تکمیل کی طرف رجُوع ہے ۔ یہ گرجا لمحہ وقت سے پرے ہمارے ہم زاد ستارے میں ہر دم ہمارے اِنتظار کی رگ سے وابستہ رہتا ہے اور اس ہی جہان کی حد پہ ، ایک تل میں ، ہم اپنے خُدا کو چھُو دیکھتے ہیں اور خدا کو ہم چھُوتے ہیں اس کے ہم گُفتار ہو کر ، اس کے کلام کی رفتار میں اپنے تخّیل کی حیرت کو سمو کر ۔ اسی اصیل حرکت میں شاعِری کی ساعت ہے اور شاعِری تسلسل کا ایک باغ ۔

وقت کے حافظے میں تسلسل کا یہ باغ خود اُگتا ہے ۔ اس باغ کی سہار کائنات کی تمام جان جنبش ہے ۔ یہاں ہر کرن کا حِساب رکھا جاتا ہے اور ہر ایک وزن کا سُراغ ۔ واپسی کی ہر رگ کو اس باغ میں بے تار کی رنگت ہے ۔ ہر پہلے قدم کی چاپ آپ سے آپ یہاں محفُوظ ہو جاتی ہے اور ہر ستارے میں ٹُوٹ کی خبر یہاں سُورج کا انگ خود دیکر جاتا ہے ۔

یہ باغ ہماری پھیلتی گہرائی کا در ہے کہ جس کے ورے کی زمین پہ ہر شام ، ہماری ہَوا ، بینائی کے سیاہ و سفید پتّھر بکھیر جاتی ہے ۔

یہ تسلسل کا باغ شاعِر کا واحد وطن ہے ۔ اب اس وطن کی چاہک چھاؤں میں ہم لمحۂ اکمل کی جانب بھی چل سکتے ہیں ۔

یہاں ہم خُدا کے ہاتھ میں بالکل ویسے ہی ہیں جیسے یہ اکمل مہک ہماری مُٹھی میں ۔

اِنسان دِن میں جیتا اور ہر رات اس جینے سے فوت ہوتا ہے ۔ اگر ہمارا خُدا چاہتا تو ابد کے آ پہنچنے تک ایک رات رہتی یا اس کا کل ایک دِن ۔ مگر اس اسم کے سکوت

میں وُہ خود ازل کو روشن کر کے دِن اور رات سنوارتا ہے اور پھر اس دِن اور رات کے خم پہ سکُوت کی ایک دھاری یک رنگ میں چھوڑ جاتا ہے۔ اس دھاری میں آتے دِن کا نصیب تعین ہوتا ہے اور جاتی رات کا اجر یکا یک تقسیم۔

یہ دھار سُراغ نہیں ہے بلکہ سُراغ کا منبع ہے۔

اور یہ دھار اس راست رسم میں قائم ہماری تلاش کی طالب رہتی ہے۔ اس ملت کی تلاش اور اس دھار کی یک رنگت میں شمولیت کی طلب ہر شاعر کا ورثہ ہے۔ یہ وُہ رنگت ہے جو ہم دیکھتے نہیں ہیں بلکہ بس الفاظ کی رَونق میں سُن سکتے ہیں۔ یہ بادِ آزاد ہے اور اب اس بادِ آزاد کی حدیث تلک سعی صِرف ہمارے اپنے اختیار میں۔

جاوید شاہین ہمارے اس ورثے سے آگاہ ہیں اور اپنے الفاظ میں اس راست رسم کے متلاشی۔ مگر اس کھوج کا ایک خراج بھی ہے اور اس رسم کا ایک رواج ــــ کُچھ عالم مندرجہ ذیل اشعار کو حضرت علی کرّم اللہ وجہہٗ سے منسُوب کرتے ہیں۔ میرے نزدیک اس بات میں شک کی گنجائش نہیں کیونکہ ہمارے علی کرّم اللہ وجہہٗ کُچھ ایسی ہی سج کے تھے۔

بقدر الکدّ تکتسب المعالی

ومن طلب العلیٰ سھر اللّیالی

یغوص البحر من طلب اللآلی

ویحظی بالسّیادۃ والنّوالی

ومن طلب العلی من غیر کدٍّ   اضاع العمر فی طلب محال

(اعتنا اور آمادگی کی مناسبت سے ہم نمو پاتے ہیں اور جو بلندی کا طلب گار ہے اس پہ لازم ہے کہ بے شمار غیر منید کی راتیں کاٹے۔ موتی کا متلاشی سمندر میں غوطہ زن ہو کر کامل عزت اور وقار کا حامل ہے۔ مگر جو نمو کی طلب اس کو پانے کی اعلیٰ سعی کے بغیر کرتا ہے وہ اپنی جان اَن ہونی کی تلاش میں گنوا دیتا ہے۔)

صلاح الدّین محمود
یکم ذیقعد ۱۳۸۸ھ

۱۹۶۶ء سے ۱۹۷۰ء تک

○

موجۂ درد سے جسموں میں روانی دے جا
خشک دریاؤں، ندی نالوں کو پانی دے جا

کچھ تو سمجھا دے طلسماتِ شب و روز مجھے
اِن حصاروں میں کوئی بابِ معانی دے جا

ظلمت و حبس دل و جاں میں جلا شمع ہوا
تُو کہیں ہے تو مجھے اپنی نشانی دے جا

میں سُبک سیر سہی، مجھ کو پرِ خس نہ بنا
اِن ہواؤں میں مجھے تھوڑی گرانی دے جا

نامکمل ہے کوئی بابِ چمن جن کے بغیر
قصۂ گُل کے وُہ اوراقِ خزانی دے جا

کب سے بے آب ہیں آئینے مری آنکھوں کے
اِن نئے چہروں میں کچھ شکلیں پرانی دے جا

آگ برساتے ہوئے دِن کی حدّیں باندھ کبھی
گرم شاموں میں کوئی شام سہانی دے جا

ہر گھڑی دِل سے گریزاں ہیں اُمیدیں شاہینؔ
اِن مکینوں کو ذرا شوقِ مکانی دے جا

○

وُہ ایک حرفِ شگفتہ جو لوحِ جاں پہ رہا
اُسی کا زہر بھرا ذائقہ زباں پہ رہا

تہِ سفینہ کو پکڑے رہی جمی کائی
نم ہوا سے بہت زنگ بادباں پہ رہا

یہ کیسی بانجھ شبوں کا ہے بے ثمر موسم
کہ بابِ چشم کھلا خوابِ رائیگاں پہ رہا

بدن کی گرمئ خواہش نہ جا سکی دِل تک
کہ آندھیوں کا بھی زور سائباں پہ رہا

طلب کے ساتھ تھا ہر دم سراب حاصل کا
غزالِ تشنہ کھڑا چشمۂ رواں پہ رہا

ٹھہرتا ہی نہیں شاہیں کوئی مکیں دِل میں
عجب مہیب سا سایہ بھرے مکاں پہ رہا

○

فقط کثرتِ بام و دَر دُور تک

کہ بے وضع ہے یہ نگر دُور تک

بتا تیرے برگ و ثمر ہیں کہاں

کھڑے ہیں برہنہ شجر دُور تک

دبی خواہشوں کی خبر لے کبھی

گھنے جنگلوں سے گزُر دُور تک

سُنوں کیا کہ ہر گفتگو بے طلب،

یہاں ہے نہ ہونے کا ڈر دُور تک

رہُوں کیا کہ یہ ہیں نئی بستیاں

یہاں ایک جیسے ہیں گھر دُور تک

کھُلے پانیوں میں رہے گا مزا
تعاقب کریں گے بھنور دُور تک

رہِ رنجِ دِل اتنی سرسبز تھی
کیا میں نے تنہا سفر دُور تک

مرا کون شاہیں کرے گا علاج
رگ و پے میں ہے نہرِ زر دُور تک

○

دِلوں کی خشک زمیں سبز کر ہی جاؤں گا
نیا لہو ہوں، رگوں میں اُتر ہی جاؤں گا

ہوس کا رنگ اگر خواہشوں پہ ہے تو رہے
کہ جنگلوں سے سرِ شب گزر ہی جاؤں گا

پسِ زباں رہا کب تک میں حرفِ ممنوعہ
نکل پڑا ہوں تو اب سب کے گھر ہی جاؤں گا

جو راہ میں ہے خنک آبِ جو، گھنی چھاؤں
یہ لازمی تو نہیں، میں ٹھہر ہی جاؤں گا

چمن میں اب کے وہ طوفانِ باد ہوں شاہیںؔ
گرا کے سوکھے ہوئے سب شجر ہی جاؤں گا

○

دن رات مکدّر سی فضا ساتھ ہے میرے
ٹھہرے ہُوئے موسم کی بلا ساتھ ہے میرے

اُٹھتے ہیں رگ و پے میں ہوس رنگ بگولے
خواہش کی بہت گرم ہوا ساتھ ہے میرے

ٹھہروں تو ڈراتا ہے کڑی دُھوپ کا منظر
چلتا ہُوں تو اِک پیڑ گھنا ساتھ ہے میرے

جی میں ہے کہ بوسیدہ بدن دیکھوں بدل کر
صدیوں سے یہ بے رنگ قبا ساتھ ہے میرے

بیدار رہے یُوں دشتِ تمنا میں چھٹی حِس
جیسے کوئی دُشمن بھی مرا ساتھ ہے میرے

بوجھل ہے بہت زخمِ مسلسل کی ہری شاخ
جس رُت میں بھی جو پھول کھِلا ساتھ ہے میرے

کچھ بے سروسامانیاں ہیں ننگِ اقامت
کچھ نقلِ مکانی کا مزا ساتھ ہے میرے

وُہ بات اُسے کہہ دُوں یہی وقت ہے شاہیں
جس بات پہ سب خلقِ خدُا ساتھ ہے میرے

○

ہوئے جمع افکار سر میں بہت
پڑے پیچ عرضِ ہنر میں بہت

گریزاں ہے ہر منظرِ جسم و جاں
کوئی شے ہے اندر سفر میں بہت

ستانے کو باہر بلائیں کئی
ڈرانے کو آسیب گھر میں بہت

کہوں کیا کہ ہے سانس اُلجھی ہوئی
ہوا بند ہے اِس نگر میں بہت

اُمیدِ ثمر رکھ مسافر ابھی
کہ زہرِ خزاں ہے شجر میں بہت

○

یہ جاں گدازِ سفرِ دامِ خواب ہو نہ کہیں
رَواں ہے جس میں سفینۂ سراب ہو نہ کہیں

یُونہی اُترتا نہ جا سَرد گہرے دَریا میں
چمکتا ہے جو بہت سحرِ آب ہو نہ کہیں

کھڑا جو جھانکتا ہے کب سے گرم کمروں میں
گلی میں ٹھٹھرا ہُوا ماہتاب ہو نہ کہیں

ہَوا یہ کون سی چلتی ہے آر پار مرے
کھُلا ہُوا کسی خواہش کا باب ہو نہ کہیں

دِلوں پہ کیوں نہیں کرتیں اَثر تری باتیں
زمیں تو ٹھیک ہے پانی خراب ہو نہ کہیں

غبار سے بھری بوجھل فضا ہے دِل پہ محیط
گرج رہا ہے جو سَر میں سحاب ہو نہ کہیں

سجائے پھرتا ہے جس کو وُہ کوٹ پر شاہیں
مرے ہی خوں کا مہکتا گلاب ہو نہ کہیں

○

محرومِ نقشِ پا ہے جو اُس راہ پر بھی جا
جاتا نہیں ہے کوئی جدھر اب اُدھر بھی جا

اِن وضع داریوں کو نہ اتنا عزیز رکھ
وعدہ عذاب بننے لگے تو مُکر بھی جا

یُوں ہی بچا نہ اپنی کشادہ دِلی کی دُھوم
رُوٹھا ہُوا ہے جِس سے کبھی اُس کے گھر بھی جا

زنجیر بن نہ جائے کہیں پاسِ ہمرہی
واماندگانِ راہ سے آگے گزر بھی جا

ہے مثلِ حرفِ تلخ تو ہر چند لب پہ گونج
زہرابِ درد ہے تو رگوں میں اُتر بھی جا

محسوس کر تپش ذرا حالاتِ گرم کی
شعلوں بھری زمیں پہ کہیں پاؤں دھر بھی جا

ہاں بے سبب نہ باندھ ضدیں تیز دھوپ سے
سایہ ہو آس پاس تو پل بھر ٹھہر بھی جا

○

اب یہاں لوگوں کے دُکھ سکھ کا پتا کیا آئے
بند ہوں گھر تو مکینوں کی صدا کیا آئے

ڈوبتے دِن کی جلو میں نہ سکوں ہے نہ فراغ
شفقِ شام سے چہروں پہ ضیا کیا آئے

سرد سینوں میں پنپتے ہی نہیں درد کے بیج
اِن خرابوں پہ برسنے کو گھٹا کیا آئے

دُور ہو کیسے ترے جسم، تری جاں کی گھٹن
تنگ، بے روزن و دَر گھر میں ہوا کیا آئے

خشک پتے ہیں کہ جھڑتے ہی نہیں شاخوں سے
کیسے تبدیل ہو رُت، رنگ نیا کیا آئے

کھو چکے لطفِ سحر خیزی گراں خواب مکین
صبحِ دم بند دریچوں میں صبا کیا آئے

گرم ہنگامہ کرے کون رگوں میں شاہیں
خشک ندیوں میں کوئی موجِ بلا کیا آئے

○

یہ برف زار بدن سے نہ جاں سے نکلے گا
لہو ہو سرد تو شعلہ کہاں سے نکلے گا

ہزار گھیرے رہے جبر کا حصارِ سیہ
کہ بابِ راہِ اماں درمیاں سے نکلے گا

جو تلخ حرف پسِ لب ہے، عام بھی ہو گا
چڑھا ہے تیر تو آخر کماں سے نکلے گا

جو پیڑ پھل نہیں دیتے وُہ کاٹتے جاؤ
خزاں کا زہر یونہی گلستاں سے نکلے گا

ذرا چلے تو سہی پانیوں پہ تیز ہوا
کھڑا سفینۂ نہ کھلے بادباں سے نکلے گا

کوئی تو کام لو عزم سے، رگیں، ہی گرماؤ
جلیں گی شمعیں، اندھیرا مکاں سے نکلے گا

کھلے ہیں راستوں کے بھید تو سمجھ شاہیں
یہ کارواں سفرِ رائیگاں سے نکلے گا

○

دامنِ شب میں چاند کا منظر بھی دیکھ لے

سونے سے پہلے کمرے سے باہر بھی دیکھ لے

اِن موسموں کی راہ میں یُوں بے خبر نہ بیٹھ

رہتا ہے کون کون سفر پر بھی دیکھ لے

گُم سُم رکھے گی تجھ کو کہاں تک وہ ایک یاد

مُنہ سے ہٹا کے میلی سی چادر بھی دیکھ لے

دھندلا رہی ہے کس لیے شمع بدن کی لَو

کوئی غبار سانس کے اندر بھی دیکھ لے

آباد زیرِ آب ہیں ڈُوبے ہُوئے نگر

یادوں کے پانیوں میں اُتر کر بھی دیکھ لے

فرصت ملے تو کھول چھپی خواہشوں کے راز
گنجان جنگلوں سے گذر کر بھی دیکھ لے
شاہین بدن تو زیر کیا جاں بھی زیر کر
دشتِ بلا سے آگے سمندر بھی دیکھ لے

○

بگولے بہت ہیں مری گھات میں

گھِرا ہُوں عجب دشت حالات میں

کبھی خوُں سے رنگیں بھی ہو چشمِ تر

دھنک بھی نظر آئے برسات میں

کِسی درد کی آنچ دے کر پرکھ

چمکتی ہے اِک شے مری ذات میں

لکیروں کا ہر سلسلہ بے کراں

کھُلے پانیوں کا سفر ہات میں

وُہی تیری آنکھوں کے حیرت کدے

وُہی میں جہانِ طلسمات میں

کبھی گھر کی بیمار ضَو سے نکل
ذرا گھُوم پھر چاندنی رات میں
بچھا ہے کہیں ذہن میں دام سا
پھڑکتا ہے کوئی خیالات میں
بجا نرمیٔ لفظ سَشا ہیں مگر
لیے پھر کوئی سنگ بھی ہات میں

○

آنکھ میں کتنے طلسماتِ جہاں پاؤ گے

خُون رنگیں ہے تو سو رنگ یہاں پاؤ گے

ہو فراغت تو ذرا جھاڑو خیالوں کے شجر

شاخساروں پہ بہت برگِ خزاں پاؤ گے

یُوں چھپائے نہ پھرو دِل میں شکستہ شیشے

کرچیاں بکھریں تو رگ رگ میں رواں پاؤ گے

رشتۂ تارِ نظر سے ہے اُجالوں کا بھرم

آنکھ جھپکی تو کوئی اور سماں پاؤ گے

موجۂ ریگِ درخشاں کے تعاقب میں رہو

اِن سرابوں ہی میں پانی کا نشاں پاؤ گے

یہ خرابہ ہی سہی اِس سے نہ باہر نکلو
چھوڑ کر دِل کو کہیں پھر نہ اماں پاؤ گے

سانس اُلجھی ہوئی آتی ہے تو ہے کس کی خطا
آگ اندر ہے تو اندر ہی دُھواں پاؤ گے

کس قدر شور ہے لوگوں سے بھری گلیوں میں
غور سے دیکھو بہت خالی مکاں پاؤ گے

کشتِ دِل ہی سے کوئی چشمہ نکالو شاہیںؔ
خشک سالی میں یہاں پانی کہاں پاؤ گے

○

زرد پیڑوں پہ ہرا رنگ ذرا آنے دے
اِس طرف بھی نئے موسم کی ہوا آنے دے

جنبشِ چشم سے گرما دے مرا سرد لہو
سُست دریا کو سمندر کی صدا آنے دے

شاخِ حالات سے اب جھاڑ بھی دے ترشی ثمر
تلخ ہونٹوں پہ کوئی تازہ مزا آنے دے

یُوں تو کھا جائے گی ظلماتِ دِل و جاں سب کو
بند کمروں میں کہیں سے تو ضیا آنے دے

گرم راتوں میں خنک ضو کی پڑے دِل پہ پھوار
سُرخ ہاتھوں کی کوئی شمعِ حنا آنے دے

خشک پتّوں سے بھری شاخیں ہُوئیں بارِ نظر
باغ کا سب سے بڑا پیڑ ہِلا آنے دے

جمع ہے ذہن میں کتنا خس و خاشاکِ خیال
اِس کھڑے پانی میں بھی موجِ بلا آنے دے

خواہشِ سایہ مجھے چلنے نہ دے گی شاہیںؔ
راہ کی پہلی یہ دِیوار گرا آنے دے

سوختہ سینوں میں ہر شمعِ سُخن خاموش ہے
جب سے وُہ آیا ہے، ساری انجمن خاموش ہے

زیرِ ظلمت سے اُبھرتی ہی نہیں موجِ سحر
آبِ شب پر چاند کی اِک اِک کِرن خاموش ہے

اِس گھڑی دِل سے نکل آئے تری سہمی صدا
بند ہے دِن کی ہوا، جسموں کا بَن خاموش ہے

اب کہاں خوں میں وُہ پہلی سرسراہٹ کے مزے
خواہشوں کے سانپ مرنے پر بدن خاموش ہے

گُم نہ ہو جائے طلسمِ راہ میں دردِ سفر
پاؤں میں خارِ شکستہ کی چبھن خاموش ہے

پھر عطا کر دِل کو کوئی تیشۂ سوزِ نہاں
سنگ زارِ زندگی میں کوہکن خاموش ہے

کوئی اُس پر دعوائے ارزانیِ خوں کیا کرے
مدعی چُپ ہے، دریدہ پیرہن خاموش ہے

کوئی آندھی، جس سے جسِ برگ و گل ٹوٹے ذرا
گرم دوپہروں میں شاہیں یہ چمن خاموش ہے

○

اسیرِ دشت طلسماتِ آب سے نکلے
بہت دِنوں میں سفینے سراب سے نِکلے

تپش ہے ایسی شبوں میں کہ اُڑ گئی نیندیں
سبھی چمکتے ہوئے رنگ خواب سے نِکلے

حصارِ جبر سے ممکن نجات تھی لیکن
جُھکا کے سر نہ کسی تنگ باب سے نکلے

کبھی تو درد کا شعلہ زبان پر بھڑکے
دہکتا خون رگوں کے عذاب سے نکلے

بھرے گھروں سے بچھڑنے کا غم نہیں شاہیں
یہی بہت ہے کہ شہرِ خراب سے نِکلے

○

تحسینِ بے حساب سے خوں سرد ہوگیا
اس چاندنی میں دفنِ گُل درد ہوگیا

شہرِطرب کے موڑ پہ یہ کیا ہُوا اُسے
دیکھا مجھے تو دیکھتے ہی زرد ہوگیا

یُوں دفعتہً خیال میں آندھی کوئی چلی
منظر دِل ونظر کا ہمہ گرد ہوگیا

پھر دردِ آب دار کا تیشہ کوئی نکال
اِس برف زار میں تو بدن سَرد ہوگیا

شاہیں یہ وقت ہے رگِ ظُلمات کاٹ دے
چہرہ مریضِ شب کا بہُت زرد ہوگیا

خسِ بدن میں برنگِ شرار آئے کوئی
چمک اُٹھوں میں، غمِ آبدار آئے کوئی

ہے زخم زخم بدن سنگِ حرفِ تلخ سے آج
کہیں سے نرمئ لب کی پھوار آئے کوئی

مری نظر میں چمکتے ہیں گرم و سردِ جہاں
میں جانچ لوں گا زرِ کم عیار آئے کوئی

میں جل گیا دلِ ویراں کی خشک وادی میں
فرازِ درد سے پھر آبشار آئے کوئی

ہے رزمِ شعلہ تو دیکھے ہوائے درد کا زور
چراغ ہے تو سرِ رہگذار آئے کوئی

یہ دشتِ تشنہ لبی چھوڑ کر میں کیوں جاؤں
مرے لیے تو یہیں جوئے بار آئے کوئی

غنیمِ شب کو میں زخموں سے چور کر آیا
سحر کا آخری نیزہ بھی مار آئے کوئی

اِک اور بھی ہے جہاں اِس جہاں سے بہت دُور
مجال ہے تو وہاں شہریار آئے کوئی

ٹھہر گئے ہیں کہاں میرے ہم سفر شاہیں
کھڑا ہوں دیر سے، جنگل کے پار آئے کوئی

○

دِلِ گرفتہ کے سب پیچ و تاب کھول کے دیکھ
ہوا کا زور محیطِ حباب کھول کے دیکھ

مرے لہو کو نمائش گہِ وفا سے اُٹھا
ہے جمع و خرچ بہت، یہ حساب کھول کے دیکھ

یہ کس طلسم سے ہر شے ہے مثلِ سنگ خموش
اے نقش گر! درِ شہرِ خراب کھول کے دیکھ

کہیں تو دشت میں ٹھہرے گی موجِ آبِ گریز
رواں ہوا ہے تو رازِ سراب کھول کے دیکھ

دھڑکتے دل سے نہ موجوں کی رزم گہ میں اُتر
خطِ سفر کو کفِ دستِ آب کھول کے دیکھ

ہیں کب سے تشنۂ معنی مرے حروفِ بدن
فراغ ہو تو کبھی یہ کتاب کھول کے دیکھ

ذرا سُراغ لگا میرے رنگِ خستہ کا
غموں کی دُھوپ میں بندِ نقاب کھول کے دیکھ

گلوں کو کس لیے ڈستی ہیں چاندنی راتیں
کہاں ہے زہرِ رگِ ماہتاب کھول کے دیکھ

مزا تو جب ہے کہ گلشن میں جشنِ شعلہ ہو
بھری بہار میں داغِ گلاب کھول کے دیکھ

کنارِ دشتِ بلا کون ہے مکیں شاہیں
خموش، سُونی حویلی کا باب کھول کے دیکھ

○

جو برف زارِ چیر دے ایسی کرن بھی لا
پتھر دِلوں میں آج کوئی کوہکن بھی لا

اِس طرح سرسری میرا بابِ وفا نہ لکھ
وقتِ حسابِ جسم، مرا خستہ تن بھی لا

منصف اگر بنا ہے تو سب کو گواہ رکھ
اِنصاف ہے تو میرا اپھٹا پیرہن بھی لا

جلنے لگے ہیں پیاس سے پھولوں کے خشک ہونٹ
ابرِ بہار کو ذرا سُوئے چمن بھی لا

چُپ چاپ خلوتوں میں پگھلنے سے فائدہ
کوئی چراغ ہے تو سرِ انجمن بھی لا

یہ چشمِ التفات ہی کافی نہیں مجھے
میرے لیے تو نرمیٔ کام و دہن بھی لا

اتنا وہ شادماں مجھے اچھا نہیں لگا
اُس گُل کے دِل میں خار کی تھوڑی چبھن بھی لا

زخمِ سفر کے دردِ مسلسل کا سحر توڑ
نکلا ہُوا وطن سے غریبُ الوطن بھی لا

شاہینؔ اُسے عزیز ہے اپنا لہو تو کیا
نعشِ شہید کے لیے رنگیں کفن بھی لا

○

اِس شب میں جانے کب ہو مہِ حُسن کا طلُوع
بُجھتے ہُوئے دِلوں سے ضِیا مانگتے رہو

جو توڑ دے بدن میں خموشی کے سب حصار
دِل سے وُہ سخت سنگِ صدا مانگتے رہو

بہتر ہے فردِ دِل میں برابر رہے حساب
اُس سے وفا کرو تو صِلا مانگتے رہو

کھُل جائیں گرم تنگ مکانوں کے سب کواڑ
موسم عجب ہے، تیز ہوا مانگتے رہو

توڑو فریبِ سایۂ اشجار بار بار
راہِ طلب سے اپنا پتا مانگتے رہو

ممکن ہے زیرِ ریگِ رواں موجِ آب ہو
تفسیرِ رازِ دشتِ بَلا مانگتے رہو

تپتی رہیں رگیں کسی زہرابِ درد سے
ہونٹوں پہ کوئی تیز مزا مانگتے رہو

اِن ظُلمتوں کے بارِ گراں سے جُھکے نہ سَر
شعُلے کی ایک یہ بھی ادا مانگتے رہو

شاہیں معاملاتِ جہاں میں محافظ کیا
اُس سے حسابِ خلقِ خدُا مانگتے رہو

○

شہرِ طرب نہ جانبِ گلشن سے آئے گی
صبحِ بہار اِس دلِ روشن سے آئے گی

رہنے دو باز زخمِ تمنّا کہ آس کی
بھٹکی ہوئی کرن اسی روزن سے آئے گی

چلنے کو ہے ہوائے خزاں کی برہنہ تیغ
پیڑوں کی دل خراش صدا بَن سے آئے گی

اِس تیرگی میں بیٹھے رہو دِل کے رُو برُو
آئے گی جو کرن اِسی چلمن سے آئے گی

کِس کو خبر اُداس کرے کِتنے سیم تن
وہ بوئے سُرخ جو ترے دامن سے آئے گی

میں خُوش ہُوں مجھ پہ کرتے رہو کوئی راہ بند
حدّت سی خوُن میں اسی قدغن سے آئے گی

شاہیں میں جانتا ہُوں گھٹن پل دو پل کی ہے
پھر موجۂ ہوائے خنک سَن سے آئے گی

○

بیگانگی کے بام سے پل بھر اُتر کے دیکھ
میں کون ہوں، مجھے بھی ذرا آنکھ بھر کے دیکھ

کیوں بدگماں ہے خلقِ خدا تیری ذات سے
لوگوں میں بیٹھ اور ذرا بات کر کے دیکھ

ایسی کرن کہ جوڑ سکے رشتۂ بدن
اِن ظُلمتوں میں فاصلے قلب و نظر کے دیکھ

دشتِ بلا میں کتنے بگولے ہیں گھات میں
میں تو گزر چُکا ذرا تُو بھی گزر کے دیکھ

اعزازِ خسروی سے نہ میری وفا کو جانچ
فرصت ملے کبھی تو مرے زخم سر کے دیکھ

کس زہر کے اثر سے اُلجھتی ہے میری سانس
دَم بھر دھواں دھواں سی فضا میں ٹھہر کے دیکھ
شاید وہ گاؤں اب تری قسمت میں ہو نہ ہو
بہتر ہے خواب اُجڑے ہوئے بام و در کے دیکھ

○

تاریک جسم، سرد رگوں میں دُھواں ہے کیوں
اِک تیز، تُرش ذائقہ خوں میں رواں ہے کیوں

دائم عذاب سا ہے مجھے تشنگیٔ زمیں
چاروں طرف سے گھِرے ہُوئے آسماں ہے کیوں

پھولے پھلے ہیں پیڑ تو پھل اِن کا کیا ہُوا
دشوار منزلوں کا سفر رائیگاں ہے کیوں

اِک وہم ہے کہ ہٹتا نہیں آنکھ سے پرے
اِک روشنی میں داغِ سیَہ درمیاں ہے کیوں

جیسے بچھا ہُوا ہے کوئی دام ہر طرف
ایسا نہیں ہے پھر مجھے ایسا گماں ہے کیُوں

شاہیں نہ کچھ غرُوب نہ ہوتا ہے کچھ طلُوع
مدّت سے میرے سامنے دُھندلا سماں ہے کیوں

○

اِک عجب وحشت سے دِل سینوں میں بے کل ہو گئے
چاند کیا نکلا خوشی سے لوگ پاگل ہو گئے

دُھوپ سے سہمے پرندوں کو اماں ملتی نہیں
سختیٔ مہرِ خزاں سے خشک جنگل ہو گئے

راہ میں چھاؤں ذرا سی کر گئی مجھ کو خراب
دو گھڑی رُکنے سے میرے پاؤں بوجھل ہو گئے

اب تو بھرتا ہی نہیں بے آب آئینوں میں رنگ
کون سے منظر مری آنکھوں سے اوجھل ہو گئے

بے حسی آخر نکل آئی مرے غم کا علاج
برف رکھنے سے مرے گھاؤ سبھی شل ہو گئے

کیا بتاؤں بدگماں دل میں تمناؤں کا حال
اس زمینِ شور میں سب پیڑ بے پھل ہو گئے

○

ہاں یاد ہے شبوں کا وُہ منظر بُجھا ہُوا
جب چاند بھی تھا شہر کے اُوپر بجھا ہُوا

وُہ میرا غم گُسار، مرا خاص رازداں
بیٹھا ہے اِن دنوں میرے اندر بُجھا ہُوا

اے میری زندگی کی تب و تاب لوٹ آ
میں ہُوں وَداعِ شُعلہ سے پتھّر بُجھا ہُوا

کچھ کم ہی اُس کا ذکر کرو دوستو کہ آج
وہ نام ہے کہ زہر میں خنجر بُجھا ہُوا

بیٹھے رہو دِلوں میں متاعِ ہُنر لیے
اِس دَور میں ہے آنکھ کا جوہر بُجھا ہُوا

رنگت گلابِ حرفِ وفا کی اڑی ہُوئی
نغمہ نوائے شوق کا لب پر بجُھا ہُوا

اُتری ہُوئی ہے لَو سے چراغوں کی روشنی
شعلہ شراب کا تہِ ساغر بجُھا ہُوا

شاہیں درونِ خانہ کوئی بات ہے ضرور
میں اور یُوں ہو میرا مقدّر بجُھا ہُوا

○

بند ہُوں کب سے جسم و جاں میں دیکھ
زہر چُپ کا مری زباں میں دیکھ

خُونِ ناحق کئی ستاروں کا
چاند کے چشمۂ رواں میں دیکھ

تُو رگِ جاں کے پاس ہے، پھر بھی
کوئی بیٹھا ہے درمیاں میں دیکھ

اُس رُخِ زرد میں کشش ہے عجیب
اِک نئی بُوئے گُل خزاں میں دیکھ

اے اسیرِ ادائے تنہائی
گھوم پھر کر بھرے جہاں میں دیکھ

جَل رہا ہے کوئی اُداس بدن
جامۂ تارِ پیرہناں میں دیکھ

کِس لیے بدگمان ہیں راہیں
کون شامل ہے کارواں میں دیکھ

اب تو آسان ہے دیکھنا شاہیںؔ
قید ہے کون آسماں میں دیکھ

○

ایک ہی درد کا جادُو جاگا
کِسی شب میں کِسی شب تُو جاگا

مستیٔ رنگ سے غنچہ چٹکا
اپنی ہی مُشک سے آہُو جاگا

خواب کے گرم شبستانوں میں
رہروِ تشنہ لبِ جُو جاگا

رَت جگوں کے مزے مجھ سے پُوچھو
میں تہِ سایۂ گیسُو جاگا

خوب ہے اب کے چراغانِ بہار
خشک آنکھوں میں بھی آنسو جاگا

پھر نیا غم، ہو مبارک شاہین
شبِ تاریک میں جگنو جاگا

○

تلخیٔ زہر ابھی شاملِ جاں رہنے دے
مجھ پہ جو گزری ہے کچھ اس کا نشاں رہنے دے

یہ نہ بجھے جو سرِ رہ روئی ہوئی شمعیں نہ ہٹا
چند گھڑیاں خلشِ عیشِ گراں رہنے دے

دیکھ اُجڑے ہوئے منظر ابھی دِلِ سوز نہیں
اور کچھ روز یونہی جورِ خزاں رہنے دے

کچھ تو روشن ہوں مرے جسم کی تاریک گپھیں
موجۂ خوں پہ کوئی شمع رواں رہنے دے

وُہ ترے درد کی گہرائی کہیں دیکھ نہ لے
ڈوبتی آنکھوں میں بس ایک سماں رہنے دے

زرد اُترے ہوئے چہرے کی اُداسی نہ چھپا
نوحۂ رنج کو محرُومِ زباں رہنے دے

چند گُم نام سی یادوں کی مہک ہے دِل میں
اِس خرابے میں یہ گُل ہائے خزاں رہنے دے

بات جو کچھ بھی ہے کُھل کر اسے کہہ دے شاہیںؔ
یُوں نہ شعلہ تہِ خاشاکِ نہاں رہنے دے

۱۹۵۲ء سے ۱۹۵۶ء تک

○

کشاکشِ غمِ ہستی میں کوئی کیا سُنتا
ہمیں تک آ نہ سکی دِل کے ٹُوٹنے کی صدا

ہر ایک پھُول کے چہرے پہ گرد جمنے لگی
کہیں سے آج اے ابرِ بہار جھُوم کے آ

چلے تھے جِس کے بھروسے پہ رہروانِ بہار
وہ ماہتاب سرِ دشت پچھلی شب نکلا

کہیں صدائے جرس ہے نہ گردِ راہِ سفر
ٹھہر گیا ہے کہاں قافلہ تمنّا کا

ہجوم لالہ و گُل راستے سے ہٹ جائے
تلاشِ خار میں نکلا ہے کوئی آبلہ پا

گزُر کے آیا ہُوں اُن سخت منزلوں سے جہاں
تمہاری یاد کا سایہ بھی آس پاس نہ تھا
کہیں سے کوئی پکارے کہ آج پھر شاہیں
دِلوں کو ڈسنے لگا ہے دِلوں کا سنّاٹا

○

گلی کے موڑ سے میں نے جو لَوٹ کر دیکھا
اُداس، سوچ میں گُم اُس کو بام پر دیکھا

کِس دُکھی دُکھی بے خواب آنکھ کی مانند
خلاء میں لٹکا ہُوا چاند رات بھر دیکھا

کوئی تو بات ہے یارو، ذرا خبر لینا
کہ آج دُھوپ میں اُس کو برہنہ سَر دیکھا

عجیب منزلِ غم ہے، کہاں ذرا دم لیں
ہرا بھرا نہ کوئی دُور تک شجر دیکھا

سکوں نواز تصوّر تھا جس کا غربت میں
سفر سے آئے تو اُجڑا ہُوا وہ گھر دیکھا

ہٹا نہ کوئی دریچے سے ایک پل شاہیںؔ
تمام رات کھُلا اک مکاں کا دَر دیکھا

○

مہکتے گلوں میں ٹھہر جانے والے
یہ سب قافلے ہیں گزر جانے والے

گھڑی بھر نہ بیٹھے کھلی چاندنی میں
اندھیرے مکانوں میں ڈر جانے والے

نظر آ گئے سرد ویران کمرے
پلٹ آئے رستے سے گھر جانے والے

کچھ ایسی ہی نازک گھڑی ہے جو چپ ہیں
بھری بزم میں بات کر جانے والے

جلن ہے ابھی گرم زخموں میں ورنہ
کسے یاد آئیں گے مر جانے والے

○

زخمِ غمِ فراق بہت جلد بھر گیا
ایسی ہی بات تھی کہ وُہ جی سے اُتر گیا

پنہائیوں میں گونج کی ہیبت عجیب تھی
دشتِ طلب میں اپنی صدا سے مَیں ڈر گیا

رستے کے شور میں نہ اُسے میں بُلا سکا
گم سُم کسی خیال میں وُہ بھی گزر گیا

دل جیسی گرم رزم گاہِ خواہشات میں
فرصت کِسے کہ دیکھ سکے کون مر گیا

○

ہزار دشت و بیاباں نظر سے گزرے ہیں
سُراغِ سایۂ گُل میں جدھر سے گزرے ہیں

کِسے خبر ترے دامن پہ آکے ستّا لیں
وُہ قافلے جو مری چشمِ تر سے گزرے ہیں

بھڑک اُٹھے نہ کہیں پھر چراغِ دردِ طلب
ہوائے شوق کے جھونکے اِدھر سے گزرے ہیں

نہ پُوچھ کیسے خزاں کی شبوں کے دُکھ سہہ کر
بہ رنگِ بادِ بہار اس سحَر سے گزرے ہیں

دیارِ قلب و نظر سے کبھی کبھی تنہا ہیں
کمالِ ہوش میں ہم بے خبر سے گزرے ہیں

○

آئینہ سا دِکھا گئے، ہم بھی
اہلِ دل کو رُلا گئے، ہم بھی

آج تک ہے وُہ آنکھ محوِ خیال
کوئی جادُو جگا گئے، ہم بھی

یُوں بھی سُونی تھی رہگذارِ حیات
خاک تھوڑی اُڑا گئے، ہم بھی

کیا بتائیں مآلِ خواب طرب
سختیِ غم اُٹھا گئے، ہم بھی

○

اُس آنکھ میں کیا کیا تھا، یہ منظر نہیں دیکھا
جاتے ہُوئے میں نے اُسے مڑ کر نہیں دیکھا

میں اپنی حقیقت سے نہ ہو جاؤں خبردار
اِس خوف کے مارے کبھی اندر نہیں دیکھا

مجھ کو تو پکڑ رکھا ہے دھرتی کی کشش نے
کیا بوجھ جُھکا ہے مرے سَر پر نہیں دیکھا

آئینۂ صَد عکسِ جہاں ذات ہے میری
اِس پردے سے میں نے کبھی باہر نہیں دیکھا

بیٹھا ہے کوئی کب سے تری یاد میں شاہیںؔ
کیا بات ہے تُو نے کبھی وُہ گھر نہیں دیکھا

○

غبارِ عارضِ گُل دھو گئے ہم
سرِ صبحِ بہاراں رو گئے ہم

کرم کچھ خاص تھا اہلِ خزاں کا
سکوتِ لالہ و گُل ہو گئے ہم

وُہ زیرِ دار ہو یا زیرِ کاکل
بلا سایہ جہاں بھی سو گئے ہم

سُراغِ دو جہاں پانے چلے تھے
خود اپنی ہی نظر میں کھو گئے ہم

ابھی رودادِ غم چھیڑی تھی شاہیں
چلیں ٹھنڈی ہوائیں سو گئے ہم

○

دے گئے زخم نہ بھرنے والے
دھیان سے کب کے اُترنے والے

دیکھ موجیں بھتے لینے آئیں
چڑھتے دریاؤں سے ڈرنے والے

بھر گئے ایک تپش راتوں میں
رات کی رات ٹھہرنے والے

کر گئے غم کے الاؤ روشن
دل کی راہوں سے گزرنے والے

کیا کہیں کیا تھا کھُلی آنکھوں میں
کِتنے کم ظرف تھے مرنے والے

تُو بھی بدنامِ زمانہ شاہیں
اپنے وعدوں سے مُکرنے والے

○

ایک اُداسی ایک دُھواں بن کر خوشیاں لہرائیں گی
جشنِ بہاراں کے متوالو! وُہ شامیں بھی آئیں گی

آج بھی تنہائی کے ہٹھڑے لمحوں کی یلغاروں سے
بھولی بسری یادوں کی کمزور لویں تھرّائیں گی

اِن اشکوں سے دامن کھینچ کے جانے والو بات سُنو
دِل کے گہرے دریا سے آنکھیں موتی بھی لائیں گی

پھر سے کوئی پیاسا آہُو پانی دیکھ کے نکلا ہے
ریگِ رواں کی تپتی موجیں زنجیریں پہنائیں گی

کِس کو خبر پہلی کرنوں نے دِل میں کیا کیا رنگ بھرے
ڈُوبتا سُورج ہی جانے کتنی کلیاں مُرجھائیں گی

شام کی ویرانی میں جانے کتنے درد جواں ہوں گے
کتنی یادیں ہر آنسو میں اپنا آپ دکھائیں گی
اب کے برس دِل کے زخموں پر دیکھیں کیا گزرے شاہینؔ
پھر برکھا رُت آئی ، پھر نم دار ہوائیں آئیں گی

○

کبھی اُداس ، کبھی کھوئی سی نظر آئی
وُہ شکل جب بھی تصوّر کے بام پر آئی

سکوتِ لالہ و گُل ہی ہُوا حریفِ بہار
بھرے چمن میں خزاں کی خلش اُبھر آئی

یہ دِن دکھائے مجھے احتیاطِ اُلفت نے
کہ تیری یاد بھی اب سوچ کر آئی

سکوں بھی خار سا بن کر چُبھا دُکھے دِل میں
چلیں جو ٹھنڈی ہوائیں تو آنکھ بھر آئی

وہی نگاہ رہی حاصلِ غمِ اُلفت
کبھی کبھی جو تجھے بھی اداس کر آئی

بہ فیضِ دوستاں اتنا تو ہو سکا شاہینؔ
ہمیں بھی آج ہنسی اپنے حال پر آئی

○

شکستِ شوق پہ جی کھول کے جو رو لیتے
یہ غم زدہ بھی زمانے کے ساتھ ہو لیتے

نئے سفر پہ چلے ہو ابھی سے ہم سفرو!
ذرا ٹھہرنا! یہ چہروں کی گرد دھو لیتے

نشانِ قافلۂ گُل کہیں تو مل جاتا
اگر خزاں میں بگولوں کے ساتھ ہو لیتے

سکوتِ دیدہ و دِل بھی تجھے گراں گزرا
اب اور شدّتِ غم کو کہاں سمو لیتے

کہیں سے زہر ہی لے آؤ ساکنانِ چمن
بھری بہار میں، ہم خشک لب بھگو لیتے

تمام رات بہت خُون رَو چُکے شاہیں
ہوا خنک ہے گھڑی دو گھڑی تو سَو لیتے

○

دیکھو سوچ سمجھ لو پہلے، پھر بیٹھے آنسو نہ بہانا
ہم آزاد منش اِنسان ہیں، ہم کیا جانیں پیار نبھانا

طُوفان سے لڑنے والوں پر اِتنا بھروسہ ٹھیک نہیں ہے
ساحل ساحل بہنے والو، بے خبری میں ڈُوب نہ جانا

ہم مہکی مہکی پُروائی، ہم آوارہ تُند بگولے
گلشن گلشن اپنا مسکن، صحرا صحرا اپنا ٹھکانا

کب تک دِل کو جلائیں گی یہ سُوکھی سُوکھی وِیراں آنکھیں
اب کے برس بھی بھول گئے ہم موسمِ گُل میں جشن منانا

ہنس لو شاہیںؔ روز بھلا احباب کہاں مِلنے آتے ہیں
عُمر پڑی ہے بیٹھے بیٹھے مرگِ وفا کا سوگ منانا

○

سرد جھونکے غمِ دِل کو یُوں ہوا دیتے ہیں
ایک شعُلے سے کئی شعُلے بنا دیتے ہیں

سرسراتی ہے تری یاد کی جب تیز ہوا
دِل کے سنّاٹے کوئی گیت سُنا دیتے ہیں

پھر تری دِید کے بھٹکے ہُوئے پیاسے لمحے
کسی صحرائے تمنّا سے صدا دیتے ہیں

ایک ہم بھی ہیں وُہ چُپ چاپ سُلگنے والے
خوُد چراغِ تہِ داماں کو ہوا دیتے ہیں

گو ہم اِک عمر سے خاموش ہیں لیکن شاہیں
کِسی طوُفان کے آنے کا پتا دیتے ہیں

نئی غزل کے نمائندہ شاعروں کا انتخاب اور
تنقیدی جائزہ

آٹھ غزل گو

ترتیب و انتخاب
جاوید شاہین

اس مجموعے میں آپ کو زبان و بیان کی تازگی اور شگفتگی کے علاوہ نئی تراکیب ، نئے امیجز اور نئے استعارے ملیں گے جو کسی شعوری کوشش کا نتیجہ نہیں بلکہ ہم عصر سیاسی و معاشرتی صورتِ حال کی لازمی شعری پیداوار ہیں ۔

''آٹھ غزل گو'' میں یہ شاعر شامل ہیں : منیر نیازی ، ظفر اقبال ، جاوید شاہین ، سلیم شاہد ، انور شعور ، نذیر قیصر ، مراتب اختر اور ریاض مجید ۔

مکتبہ میری لائبریری ، لاہور ۲

فوسین